© rasailojaraid.com

تبصرۂ کتب

اسلام اور مغرب کا مستقبل: تہذیبوں کا تصادم یا پرامن بقائے باہمی

اسد ابو خلیل*

ترجمہ: راشد بخاری

The Future of Islam and the West: Clash of Civilizations or Peaceful Coexistence? By Shireen T. Hunter. West Port, Ct: Praeger; with the Center for Stategic and International Studies, Washington DC. 195 p. $55.00 cloth. $ 17.95 paper.

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکی خارجہ پالیسی سازوں کو یہ مشکل پیش آئی کہ اب کوئی ایسا خیال یا نظریہ باقی نہ رہا تھا جس پر آئندہ خارجہ پالیسی کے خطوط مرتب کیے جاتے۔ چنانچہ کسی ایسے مربوط تصور کی تلاش شروع ہوئی جس سے خارجہ پالیسی کے ماہرین رہنمائی حاصل کریں۔ اسی تگ ودو میں فرانسس فوکویاما کا ''انتہائے تاریخ'' کا نظریہ (۱۹۹۲ء) سامنے آیا جس کے بعد سیموئل ہنٹنگٹن نے ''تہذیبوں کے تصادم'' کا خیال پیش کیا (فارن افیئرز: ۱۹۹۳ء)۔ ان دونوں مقالوں کو بعد میں کتابی شکل دی گئی اور ان پر بحث ومباحثہ کا دروازہ کھل گیا۔ ہنٹنگٹن کا نظریہ اگر سہل ترین نہیں تو سادہ ضرور تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ دنیا ایک نئے تصادم کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں خط امتیاز نظریاتی نہیں بلکہ تہذیبی ہے۔ انہوں نے اسلامی تہذیب کو ایک خطرے سے تعبیر کیا اور اس پر مسلمانوں کی طرف سے انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں ردِ عمل کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ شیریں ٹی ہنٹر کی کتاب کو بھی ہنٹنگٹن کی کتاب سے شروع ہونے والی بحث کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ یقیناً یہ ہنٹنگٹن کا ایک جواب ہے، نہ زیادہ نہ کم۔

شیریں ہنٹر نے ''تہذیبوں کا تصادم'' کے نظریے پر اہم اور معقول تنقید کی ہے۔ انہوں نے

* Asad Abu Khalid, Book Reviews, *American Political Science Review*, Vol. 93, No.1.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جارحانہ یا مناظرانہ انداز اختیار کرنے کی بجائے غیر جانبداری اور تحمل سے بات کی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ اسلامی تہذیب ایسی یک رنگی تہذیب نہیں ہے جیسا کہ ہنٹنگٹن نے اسے سمجھا ہے اور اپنی بات کی وضاحت کے لیے مسلمانوں کے درمیان بین المسلکی اور بین المذاہب جھگڑوں اور جنگوں کی مثالیں دی ہیں۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں مسلمان ریاستوں کے دیگر مسلمان ریاستوں کی نسبت غیر مسلم ممالک سے زیادہ بہتر تعلقات رہے ہیں (جنگ خلیج اس کی تازہ ترین مثال ہے)۔ مسلمانوں کے سیاسی رویے کا تشکیل کنندہ اسلام نہیں ہے اور مسلمانوں میں مذہبی بنیاد پرستی کے عروج کی اکثر وجوہات بھی اپنی فطرت میں غیر مذہبی ہیں۔ سیاسی زندگی میں مذہب کے بڑھتے ہوئے کردار کی وضاحت بہت سے سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل سے ہوتی ہے۔ مصنفہ نے خارجہ پالیسی کا تعین کرنے والے غیر مذہبی عناصر وعوامل کی وضاحت کرنے کے لیے کتاب کا ایک پورا باب ایران اور سعودی عرب کی خارجہ پالیسیوں کے مطالعے کے لیے وقف کیا ہے۔

ہنٹر یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے روحانی اور سیاسی حلقہ اثر میں اختلاف موجود ہیں یہ بھی یاددلاتی ہے کہ مغرب بھی ایسے اختلافات سے خالی نہیں، انہوں نے اس خیال کو رد کیا ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں مطابقت موجود نہیں ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ یہودیت اور عیسائیت بھی ''مکمل'' سیکولرزم (لادینیت) کے خلاف ہیں (ص ۵۶)۔ ہنٹر اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان تصادم کی ناگزیریت کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں مسلمانوں کا مغربی ممالک سے اختلاف معاشی، سماجی اور سیاسی مسئلہ پر ہے۔ دوسری طرف ہنٹنگٹن قریب قریب یکسو ہیں کہ مغرب اور اسلام میں تصادم ناگزیر ہے۔ تہذیب کو تجزیے کی اکائی تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں اور مغربی حکومتوں کے درمیان حالیہ سیاسی کھنچاؤ کو مستقل حیثیت دے دی جائے۔ جیسے اس کی کوئی بہت گہری مذہبی وجوہات ہوں جنھیں خدا ہی مداخلت کر کے حل کرے تو کرے ورنہ دوسری کوئی صورت نہیں۔ یقیناً یہ دلیل ان مغربی قدامت پسندوں کے لیے بڑی کشش رکھتی ہے جو امریکی خارجہ پالیسی میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی مزاحمت کرتے ہیں۔ وہ امریکی ''رعایتوں'' کے خلاف ہیں کیونکہ اس دلیل کے مطابق ان سے مغرب اور دشمن تہذیبوں کے درمیان نام نہاد عالمی تصادم پر کوئی اثر نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑے گا۔

اگرچہ ہنٹنگٹن کے دعوؤں کا جواب ہنٹر نے منطقی اور معلوماتی انداز میں خوش اسلوبی کے ساتھ دیا ہے لیکن مجموعی طور پر کتاب کئی خامیوں سے پُر ہے۔ اول، کتاب پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شامل مواد کو خارجہ پالیسی کے حوالے سے کسی بھی جریدے میں ایک مقالے میں سمویا جا سکتا تھا۔ بجائے اس کے، اس میں پیش کیے گئے نکات اور دلائل کو بے جا طور پر بے حد پھیلا دیا گیا ہے۔ مسلمانوں [کے خیالات] میں یکسانیت کی کمی اور ان میں خارجہ پالیسی کا تعین کرنے والے غیر مذہبی عوامل و عناصر پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کوئی علمی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد دوسرے درجے کے ذرائع اور حوالہ جات پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ امریکہ میں جاری خارجہ پالیسی کی بحث میں اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ تیسرا، کتاب کی ترتیب بھی خاصی پریشان کن ہے۔ بہت سی چیزوں کا احاطہ کرنے کی کوشش میں اکثر ابواب میں اصل کو چھوڑ کر فروعات کی طرف دھیان چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ شیعہ سنی اختلافات کی بنیادوں کی تعارفی وضاحت کی گئی ہے۔ پہلے باب میں، مثال کے طور پر، تاریخ، سیاسی نظریہ، اسلامی قانون، الٰہیات اور بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے لیکن کسی بھی موضوع کا اطمینان بخش احاطہ نہیں کیا جا سکا کیونکہ مصنفہ ایک سے دوسرے نکتے کی طرف بے ربطی سے آگے بڑھتی ہیں۔

یہ نہیں کہ ہنٹنگٹن کے نظریے کو مضبوطی سے رد کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عالمی تجزیے کے لیے تہذیب کو بطور اکائی استعمال کرنے کے خلاف ہنٹر سے بھی آگے بڑھ کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت مستشرقین نے تہذیب کی اکائی کو گروہی برتری کے لیے استعمال کیا۔ ہنٹر اس وضاحت پر تعریف کی مستحق ہیں کہ مستشرقین کی تحریروں پر تاریخی نظر ڈالی جائے تو ہنٹنگٹن نے کوئی نادر یا انوکھا نظریہ پیش نہیں کیا۔ پرنسٹن یونیورسٹی کے برنارڈ لیوس نے تہذیبوں کے تصادم کا خیال ہنٹنگٹن کے مقالے (اور بعد میں کتاب) سے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ تجزیے کے لیے ''مغرب'' کی اصطلاح کو بطور اکائی استعمال کرنا بھی اس وقت قابل تردید ہے جب گلوبلائزیشن کا شور عروج پر ہے اور جب دنیا کے بہت سے ممالک کی سیاسی، عسکری اور مالی پالیسیاں امریکی حکومت کے اشاروں پر بنائی جاتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب کے عنوان سے بھی ایک طریقیاتی مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہ ''مغرب'' کو ''اسلام'' کے مخالف کے طور پر پیش کرتا ہے۔کسی جغرافیائی اکائی کے مقابل مذہب کو کیونکر پیش کیا جاسکتا ہے جب تک اسلام کو جغرافیہ، اسلامی قانون، مذہب اور مسلمان کی علیحدہ علیحدہ اصطلاحوں میں نہ پیش کیا جائے، جیسا کہ مستشرقین کا دستور رہا ہے۔ اسلام کی سیاسی بحث بے معنی ہے خصوصاً اس وقت جب مختلف لوگوں کے نزدیک اس کے مختلف معنی ہوں اور جب مسلمان ایک دوسرے سے مختلف اور اکثر مخالف صورت حال اور سیاسی حالات میں رہ رہے ہوں۔ دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے سیاسی حالات کو عموماً اسلام اور انتہا پسندی میں تعلق ظاہر کرنے کے لیے ایرانی انقلاب تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ مصنفہ امریکہ پر الزام تراشی کے ضمن میں ضرورت سے زیادہ محتاط رویہ اختیار کرتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ مغربی حکومتیں اپنی خارجہ پالیسیوں میں انسانی حقوق کو نظرانداز کر دیتی ہیں (جو ایسی حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کے لیے کسی حسابی ثبوت کی ضرورت نہیں) وہ کہتی ہیں کہ ''مغربی حکومتوں سے شعوری منافقت کے رجحان کو منسوب کر دیا جاتا ہے'' (ص ۲۷)۔ تو کیا جنگ خلیج اور (دوسری جارح ریاستوں میں) سعودی عرب کی امداد کا الزام امریکی حکومت کے تحت الشعور کو دیا جائے گا؟ وہ جنگ خلیج کے لیے امریکی عوام کی حمایت کو بھی مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے لیے ان کی معروف حمایت سے تعبیر کرتی ہیں (ص ۲۴)۔ ان خامیوں کے باوجود کتاب اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر ہنٹنگٹن کی تردید کرنے میں کامیاب ہے جو کہ ایک آسان کام نہیں تھا۔

© rasailojaraid.com